جدید اردو نظم میں سیاسی و مزاحمتی شاعری کے تین رنگ

(حبیب جالب ، اختر حسین جعفری ، فہمیدہ ریاض)

Three Colors of Political and Resistance Poetry in Modern Urdu Poetry

(Habib Jalib, Akhtar Hussain Jafari, Fahmida Riaz)

محمد عمران شاہد[i] ڈاکٹر مظہر عباس[ii]

Abstract:

Literature is also a metaphor for resistance. When a society was exploited, the voice was raised through literature, many movements were also active for it. So many times the shadows of dictatorship fell on the Pakistani society. Along with the injustice and violation of human rights in the society, there will also be an attempt to suppress religious, economic and freedom of expression. At that time, the poets who raised the voice of protest against the dictators are Habib Jalib, Akhtar Hussain Jafari and Fahmida Riaz. In this paper, an attempt has been made to shed light on his achievements and his struggles.

Keywords: *Modern Urdu Poetry, Urdu Poetry, Politics, Resistance, Literature, Literary Movements, Progressivism, Martial Law, Ayoub, Ziaul Haqq, Zulfikar Bhutto, Habib Jalib, Akhtar Hussain Jafri, Fahmida Riaz.*

ادب مزاحمت کا استعارہ بھی ہے۔ جب کسی معاشرے کا استحصال ہوا تو ادب کے ذریعے آواز اٹھائی گئی ، اس کے لیے کئی تحریکیں بھی سرگرم ہوئیں۔ کئی بار پاکستانی معاشرے پر آمریت کے سائے پڑے۔ معاشرے میں ناانصافی اور انسانی حقوق کی پامالی کے ساتھ ساتھ مذہبی ، معاشی اور آزادی اظہار کو دبانے کی بھی کوشش کی گئی۔ اس وقت آمروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والے شاعروں میں حبیب جالب ، اختر حسین جعفری اور فہمیدہ ریاض شامل ہیں۔ اس مقالے میں ان کی جدوجہد پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ: جدید اردو شاعری ، اردو شاعری ، سیاست ، مزاحمت ، ادب ، ادبی تحریکیں ، ترقی پسندی ، مارشل لاء ، ایوب خان ، ضیاء الحق ، ذوالفقار بھٹو ، حبیب جالب ، اختر حسین جعفری ، فہمیدہ ریاض۔

ادب میں مزاحمت کی آواز ہر دور میں سنائی دیتی رہی ہے۔ معاشرے میں بالا دست طبقہ جب عوام کا ریاست، مذہب، سیاست یا معیشت کے نام پر استحصال کر رہا ہوتا ہے تو اُس کا ہاتھ روک مزاحمت کہلاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ادب بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے۔ ادب میں یہ مزاحمت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ادیب اپنے گرد و پیش کے ساتھ مکمل ہم آہنگی نہیں کر پاتا تو اس کا اظہار ادبی تخلیقات کے ذریعہ کرتا ہے۔ اس حوالے اور نظریے سے دیکھا جائے تو سارا ادب مزاحمتی ہے اور ہر ادیب مزاحمت کار ہے۔ تاریخی حوالے سے جائزہ لیا جائے تو مزاحمت اور بغاوت کا اظہار یونانی ادب میں واضح طور پر ملتا ہے۔ قدیم یونان میں جو جمہوری اور سیاسی مزاج تھا، اس نے ادب میں مزاحمتی رویوں کے لیے گنجائش پیدا کی اس طرح مزاحمتی ادب کا

i پی ایچ۔ڈی اسکالر ، شعبہ اُردو ، دی اسلامیہ یونی ورسٹی ، بہاول پور (Corresponding Author)
ii اسسٹنٹ پروفیسر ، شعبہ اُردو ، دی اسلامیہ یونی ورسٹی ، بہاول پور۔

ISSN:2708-5724, E-ISSN:2708-5732

آغاز ہوا۔ ادب دراصل ایک ایسی تخلیق ہے جس میں تسلط، غلبہ، ناانصافی اور جبر کے خلاف مزاحمت پائی جاتی ہے۔ مزاحمتی ادب اردو میں بھی خاصا وسیع ہے۔ یہی ادب آگے چل کر سیاسی رویوں میں ڈھل جاتا ہے۔ ادب انسانی زندگی کو براہ راست متاثر کرتا ہے اور معاشروں کو شعور وآگہی فراہم کرنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

شاعری میں دیکھا جائے تو اردو میں سیاسی ومزاحمتی ادب کو قدیم شعری اصناف 'شہر آشوب' اور 'مرثیہ' ابتدائی نقوش کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان اصناف میں درحقیقت ان سماجی و ثقافتی رویوں کے جبری استحصال سے انکار کا اظہار ملتا ہے جو سیاسی و عمرانی دباؤ کے تحت انسانی زندگی میں در آتے ہیں۔ اسی جبری برتاؤ اور دستور کو جب ایک شاعر اپنے الفاظ میں 'مرثیہ' یا 'شہر آشوب' کی صنف میں ایک تخلیقی رنگ دیتا ہے تو اسے ہم مزاحمتی ادب کی شرح میں قبولیت بخشتے ہیں۔ شہر آشوب کے حوالے سے امیر عارفی بیان کرتے ہیں:

> "شہر آشوب فارسی اور اردو ادب کی اہم صنفِ سخن ہے۔ ایسی صنف جو غمِ جاناں سے نکل کر غمِ دوراں کا احاطہ کرتی ہے۔ گردشِ زمانہ، سلطنتوں، بادشاہوں، امیروں اور حکمرانوں کے سیاسی وقار کا زوال، عوام و خواص کے معاشی حالات، پستی اور زبوں حالی، فوجوں کی شکست، درباروں اور محلوں کا اجڑنا، معاشی کساد بازاری، مختلف پیشوں میں کاروبار کا فقدان، آمدنی اور کمائی میں کمی اور اس کے ساتھ سماجی گراوٹ، افسوسناک حالات کا وقوع پذیر ہونا، اقدار کا ٹوٹنا یہ صنف ایسی تمام صورتوں کا جائزہ لیتی ہے۔ شہر آشوب کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو غزل و نظم صرف گل و بلبل کی داستان اور عشق و محبت کی کہانی ہی نہیں ہے بلکہ زمانے کے نشیب و فراز کی داستان بھی ہے۔"[1]

درحقیقت سیاسی ومزاحمتی ادب تسلط کے خلاف ایک مخصوص تناظر میں لکھا جاتا ہے۔ یہ تناظر جاگیر دارانہ مسلمات کا تسلط ہو یا غالب سماجی اداروں کی اجارہ داری ہو یا پدرانہ نظام پر قائم سماجی تصورات اور جنسی تفریق کی بالادستی ہو۔ ان کے خلاف ادبی اظہار ایک ایسے مزاحمتی ادب کی شکل میں ابھرتا ہے جہاں روایتی طور پر تسلیم شدہ اصول و معیار کی نفی پر اصرار بڑھ جاتا ہے۔ اگر گہرائی سے دیکھیں تو مزاحمت ہمارے ادب کے خمیر میں رچی بسی ہے کیونکہ اردو ادب کا آغاز جس دور میں ہوا وہ سیاسی انحطاط کا ہی نہیں بلکہ

معاشرتی اور تہذیبی زوال کا عہد بھی ہے۔ اٹھارویں صدی کے آغاز ہی سے مسلمانان برصغیر کے زوال کا آغاز ہو چکا تھا۔ تاہم سیاسی زوال و انحطاط کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء ایک مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ایک طرف تو مسلمانوں کے ساڑھے چھ سو برس کے اقتدار کا خاتمہ ہوا اور دوسری طرف رفتہ رفتہ غلامی کے دور کا آغاز بھی ہوا۔ اسی دور میں بہت سے تحریکوں نے جنم لیا جن میں ایہام گوئی کی تحریک پھر تازہ گوئی کی تحریک چلی۔ اس طرح جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو علی گڑھ کی تحریک نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ اصل میں اس کا تعلق بھی مزاحمت اور سیاست سے ہے۔

علی گڑھ تحریک نے جب حالی اور شبلی جیسے لوگوں کے لیے ایک مزاحمتی پلیٹ فارم فراہم کیا تو جدید اسلوب کے ساتھ ساتھ مزاحمت کی جھلک بھی نظر آنے لگی کیونکہ اس تحریک نے ادب برائے زندگی کا نظریہ متعارف کروایا۔ ادبی دنیا میں اسے افادی نظریہ بھی کہا گیا مگر ترقی پسند تحریک جس کی بنیاد ۱۹۳۶ء میں پڑی، دراصل اردو کی پہلی خالص مزاحمتی تحریک تھی جس نے اردو ادب کے آسمان کو ستاروں سے بھر دیا۔ فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز، احمد ندیم قاسمی، جوش، ساحر اور ایسے لاتعداد شاعر اس تحریک سے وابستہ رہے۔ اسی تحریک سے وابستہ تین نام ایسے سامنے آتے ہیں جن کی شاعری میں مزاحمتی اور سیاسی رنگ کوٹ کوٹ کر بھر نظر آتا ہے۔ تینوں کی قربانیاں کہیں زیادہ ہیں لیکن اُن کو وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کے وہ حق دار تھے۔ یہ تینوں ایک ہی عہد کے شاعر حبیب جالب، اختر حسین جعفری اور فہمیدہ ریاض ہیں۔

حبیب جالب بھی مزاحمتی اور ترقی پسند شاعری کے حوالے سے چند گنے چنے شعرا میں سے ایک ہیں۔ انقلابی اور مزاحمتی شاعری ان کا مذہب اور باطل شکنی ان کا دین ایمان تھا۔ مقامی سطح سے بین الاقوامی سطح تک ان کے مزاحمتی افکار و نظریات کی اڑان نمایاں ترین بلندیوں کو چھوتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ اپنے معاشرے میں جبر و استحصال کے گڑے ہوئے پنجوں کو اکھیڑنے سے لے کر عالمی معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں اور انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف احتجاج اور باغیانہ علم بلند کرنے تک کے اہداف عبور کرنا ان کا فقید المثال شعری کارنامہ ہے۔ جہاں ظلم سر اٹھاتا ہے وہاں ان کا قلم اس ظلم کا سر قلم کرنے میں پیش پیش ہوتا ہے۔ اس میدان میں ان کے سامنے بار بار برسر اقتدار جتھے مصروف عمل ہوتے ہیں اور ان کا کام

ہر منفی قوت کا قلع قمع کرنا ہوتا ہے۔ اس زاویہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ اپنے دور کے ہر نمرود کے خلاف ابراہیمی کردار کا شعری اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جالب کا اردو مزاحمتی شاعری میں وہی کردار ہے۔

حبیب جالب بلا شبہ ایک معروف عوامی شاعر تو ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی شعور رکھنے والے سخن ور بھی ہیں۔ اپنے سیاسی شعور کو انھوں نے عوام میں سیاسی بیداری کے لیے بڑے جوش و خروش سے استعمال کیا۔ اپنے خیالات و جذبات میں زبردست ہم آہنگی اور حقیقت پسندی رکھنے والے حبیب جالب جرات و بہادری کا استعارہ تھے۔ انھوں نے سیاست کے میدان میں محض اپنے الفاظ اور اشعار سے ہی نہیں بلکہ عملی کردار سے منفرد شناخت بنائی۔ کوڑے کھائے، زندان کی صعوبتیں برداشت کیں، ظلم اور ظلمت کے خلاف حرف صداقت لکھا اور ہمیشہ بلا خوف وخطر آمریت کے سامنے عوام کی آواز بن کر ڈٹے رہے۔

ظلمت کو ضیا، صر صر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا
پتھر کو گہر، دیوار کو در، کرگس کو ہما کیا لکھنا[۲]

حبیب جالب ایک ایسے شاعر اور عوام کے بہی خواہ تھے جن کو کئی مرتبہ جیل جانا پڑا، لاٹھیاں کھانا پڑیں، کتابوں پر پابندیاں برداشت کرنا پڑیں، حاکموں کی دھمکیاں سہنا پڑیں لیکن ان سب ہتھکنڈوں کے باوجود حبیب جالب آزادی کے گیت گاتے رہے اور اپنی بلند و باہمت آواز سے ایوانوں کو لرزاتے رہے۔ اس حوالے سے خود نواب آف کالا باغ نے اپنی اس ناکامی کا اعتراف درج ذیل الفاظ میں کیا تھا:

> ''میں اپنے دورِ حکومت میں صرف ایک شخص سے عاجز آیا اور وہ تھا حبیب جالب۔ میں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا۔ اگر اس کی زمین ہوتی تو میں چھین لیتا۔ جائیداد ہوتی تو ضبط کر لیتا۔ کھیت ہوتے تو جلا ڈالتا، سرمایہ ہوتا تو تنگی کا ناچ نچا دیتا مگر اس کے پاس شاعری تھی اور شاعر کا ضمیر، جس کا میں کچھ نہ بگاڑ سکا۔''[۳]

اس کے باوجود حبیب جالب کسی مصلحت کا شکار ہوئے بغیر 'ذکر بہتے خون کا' بڑے افتخار اور وقار کے ساتھ کرتے رہے، 'اس شہر خرابی میں' خوش حالی کے خواب دیکھتے رہے۔ حرف صداقت لکھنے کی پاداش میں انھیں 'عہد سزا' بھی کاٹنا پڑا لیکن یہ کڑا وقت بھی 'رقص زنجیر' سے یادگار بن گیا۔ آج بھی جب کبھی اہل قلم مصلحت کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔ ظلم گلی گلی پھیلتا جاتا ہے اور چاروں جانب سناٹا ہوتا ہے جالب جیسے جی

دار اور جری انسان ضرور یاد آتے ہیں جو تمام تر ظلم و ستم کے باوجود دیوانہ وار آزادی کے نعرے لگاتے رہے :

کوئی تو پرچم لے کر نکلے اپنے گریباں کا جالب
چاروں جانب سناٹا ہے دیوانے یاد آتے ہیں [۴]

حبیب جالب کڑے سے کڑے وقت میں بھی سچ پر ڈٹے رہے۔ ایوب کی امریت میں دستور جیسی نظم تخلیق کی جو آج ساٹھ برس گزرنے کے باوجود بھی حق و صداقت کا شاہ کار ہے۔ اس میں عوام کی آواز کو بلند آہنگ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ حکام کی چالاکیاں، قانون کے ساتھ کی گئی مفاد پرستیاں اور چیرہ دستیاں جالب نے اپنے عوامی قلم سے بے نقاب کی ہیں:

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا [۵]

اسی طرح یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے ادوارِ حکومت میں جب جب عوام پر ظلم و ستم کیا گیا، جالب نے ہمیشہ ان کے حقوق کے لیے اپنی تخلیقی توانائی مکمل طور پر وقف کر دی۔ "دستور" لاڑ کانے چلو ورنہ تھانے چلو"، "ظلمت کو ضیا"، "ریفرنڈم"، "نہتی لڑکی"، "نیلو" اور "جمہوریت" ایسے فن پارے ہیں جن میں عوامی حقوق کی خاطر ایک عوامی شاعر نے حکومتی اہل کاروں اور ایوانوں کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ حبیب جالب کو عوامی شاعر ہونے کی وجہ سے ہر سطح پر اس کی قیمت بھی ادا کرنا پڑی ہے۔ جالب کو کئی ادوار حکومت میں پابند سلاسل کیا گیا لیکن ان کے قلم کو کوئی حکومت پابہ زنجیر نہ کر سکی۔ جسمانی طور پر ان پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی گئیں لیکن ان کے قلب و ذہن کو کبھی بھی قید نہ کیا جا سکا۔ انھیں حکومتی حلقوں کی جانب سے ہتھ کڑیوں سے ڈرایا گیا، ڈنڈوں سے دھمکایا گیا اور کبھی لالچ دے کر ورغلایا گیا مگر یہ سچا عوامی شاعر ڈرانے سے ڈرا نہیں، کسی دھمکی میں نہیں آیا اور نہ ہی کسی پیش کش کو قبول کیا۔ تمام تر مصائب و آلام کے باوجود وہ پاکستان سے ویسی ہی محبت کرتے رہے جیسے تحریک پاکستان کے دوران پاکستان کے خوابوں سے دل و دماغ کو منور رکھتے تھے۔ اُن کی ساری جدوجہد پاکستان کے اس خطۂ خاک کو سرزمینِ پاک بنانے کی تمناؤں سے سرسبز و شاداب رہی تھی۔ یہاں مجھے اُن کی ایک نظم 'ہتھکڑی' یاد آ رہی ہے جس

میں انھوں نے اپنی چھوٹی بیٹی سے ہمارے روشن مستقبل کی تمنائیں وابستہ کی ہیں:

اُس کو شاید کھلونا لگی ہتھکڑی — میری بچی مجھے دیکھ کر ہنس پڑی
یہ ہنسی تھی سحر کی بشارت مجھے — یہ ہنسی دے گئی کتنی طاقت مجھے
کس قدر زندگی کو سہارا ملا — ایک تابندہ کل کا اشارا ملا[۲۱]

جب کہ ایوبی اور ضیائی عہد میں حبیب جالب کے کئی جبیبوں نے مادی ترقی اور جاہ ورفعت کے چکر میں حق بیانی کی بجائے قصیدہ خوانی شروع کر دی۔ کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ دانشوروں نے اعلیٰ عہدے حاصل کر لیے لیکن حبیب جالب ایسے شاعر اور ایسے شخص ہیں جنھوں نے اپنے فن اور شخصیت کو کسی بھی قسم کی مراعات سے سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ جہاں تک فن شاعری کا تعلق ہے اس میں بھی عوامی شاعر نے کسی قسم کی مصلحت یا منفعت کو مد نظر نہیں رکھا۔ انھیں عوامی اور معیاری شاعری کے مابین فرق کا بخوبی ادراک تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ فیض بنیادی طور پر حبیب جالب کی طرح ایک سیاسی شاعر تھے۔ دونوں کا اشتراکی نظریے سے گہرا رابطہ بھی قدرِ مشترک کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر دونوں کے ہاں شاعری ایک قابل استعمال شے ہے، ایک مہلک آلہ، ایک نشتر، جسے وہ معاشرے کے ناسوروں میں گاڑ دیتے ہیں۔ دونوں کی طنز کی کاٹ بہت گہری ہے۔ فیض کی ہمدردیاں دنیا بھر کے مظلوموں کے ساتھ تھیں، خواہ وہ جنوبی افریقہ کے باشندے ہوں، شکاگو کے مزدور ہوں یا پھر وہ ریڈ انڈین، وہ اپنے جارحانہ انداز میں ظالموں پر کھلے بندوں تنقید کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے لیے یورپی معاشرے میں مظلوموں کے محافظ کا مقام پیدا کر لیا تھا، جس کی آواز پر لوگ کان دھرتے تھے وہ حبیب جالب تھے۔ پھر فیض اور حبیب جالب کے درمیان جو فرق ہے اس حوالے سے اسلم سہراب لکھتے ہیں:

> "بعض لوگ کہتے ہیں کہ فیض اور جالب کی شاعری کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔ دونوں اردو شاعر ہیں، دونوں کا تعلق پاکستان سے ہے، لیکن جالب کے حصے میں وہ بین الاقوامی شہرت نہ آئی جو فیض کو نصیب ہوئی۔ معترضین کی بات بے وزن نہیں ہے، لیکن وہ یہ سوچتے کہ ان دونوں ترقی پسند شاعروں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ فیض نے اشاروں کی زبان میں شاعری کی ہے، جبکہ جالب نے یہی کام عوام کی زبان میں کیا ہے۔ فیض نے پڑھے لکھوں کے لیے شاعری کی جبکہ جالب نے اَن پڑھوں سے بھی داد وصول کی ہے۔

ایک غالب کا مقلد ہے دوسرا نظیر اکبر آبادی کا، ایک ہزاروں کا شاعر ہے دوسرا کروڑوں کا،
ایک دانش وروں کا شاعر ہے دوسرا عوام کا۔"[۷]

اختر حسین جعفری ایک طلسم کار تھا۔ وہ جب جذبے کو چھوتا تھا تو اسے کائنات گیر بنا دیتا تھا اور جب لفظ کو مس کرتا تھا تو اسے نئے سے نئے مفاہیم سے جگمگا دیتا تھا۔ زندگی میں اس نے دو کام کیے؛ محبت اور شاعری۔ یہ دونوں کام اس نے اتنی والہیت سے کیے جیسے عبادت سے کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس نے جس سے محبت کی اس سے زندگی بھر محبت کی۔ جذبہ محبت کی یہ تکمیل اس کی شاعری میں بھی انعکاس پذیر رہی۔ اس کی شاعری کے معیار اس کی محبت کی طرح کھرے اور اونچے تھے۔ علامتیں اس کے ہاں بولنیں لگتی تھیں اور استعارے اس کے ہاں چمکنے لگتے تھے۔ اس نے اپنے شخصی اور فنی وجود کی اس حد تک تہذیب کر رکھی تھی کہ اعلیٰ درجے کی عالمانہ گفتگو میں بھی اس کی باتوں سے پیار کی مہک امڈتی رہتی تھی۔ وہ اس قدر حساس تھا کہ اپنے بدخواہوں کے دکھ پر بھی رو دیتا تھا۔ اس نے شاید ہی کسی سے نفرت کی ہو۔ کی بھی ہو گی تو اس نفرت کے عقب میں محبت اور در گزر کا جذبہ ہی کارفرما رہا ہو گا۔ اس نے کبھی کسی کی بد گوئی نہیں کی۔

اختر حسین جعفری ایک روشن خیال، ترقی پسند، انسان دوست اور جمہوریت پسند شاعر ہیں۔ اختر حسین جعفری کی شاعری ان کے پختہ سیاسی شعور کی عکاسی کرتی ہے۔ انکی شاعری سیاسی، صحافتی یا سیاسی نعرے بازی سے دور ایک لطیف سیاسی نظریے کا اظہار ہے۔ ان کا سیاسی نظریہ مستحکم و غیر متزلزل ہے۔ ان کا سیاسی نظریہ انسانی نظریہ ہے جو مکمل انسانی زندگی سے جڑا ہوا ہے، جو انسان کی زندگی میں آسانیوں کی راہ ہموار کرنے کی جستجو کرتا ہے۔ انکی سیاسی جنگ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مارکسی نظریہ کو سپورٹ کرتی ہے۔ وہ غریبوں کا ساتھی ہے وہ مظلوم روتی ہوئی آنکھوں کی اشک شوئی کرنے والا ہے۔ وہ روئی، کپڑا اور مکان دینے والے سیاسی نظریے کا قلمی معاون ہے۔ وہ باطل کے خلاف حق کی آواز بلند کرنے والوں کا صدا کار ہے۔

اختر حسین جعفری آمریت و جابرانہ حکومت کے سخت مخالف ہیں۔ انھیں انسانی فکر و نظریہ اور اظہار یے کی مکمل آزادی عزیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ضیاء الحق نے مارشل لاء لگایا تو اختر حسین جعفری کی طرف سے شدید مزاحمت سامنے آئی۔ انھوں نے مارشل لاء کے تناظر میں نظمیں تخلیق کیں جو ادبی حلقوں میں بہت مشہور ہوئیں اور پسند کی گئیں۔ مارشل لاء کی جبری حکومت نے اختر حسین جعفری کے فکر و نظر کے

کینوس کو وسیع تر کیا۔ انھوں نے اپنی ذات کے دکھ کو بھی اپنی شاعری میں کائناتی وسعت دی ہے مارشل لاء تو پھر قومی المیہ اور لوگوں کا دکھ تھا۔ وہ اس جبر وستم پر کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ انھوں نے اس پر لکھا اور بھرپور لکھا۔ انھوں نے زبان شاعری میں بتایا کہ اس ظالمانہ حکومت پر ایک حساس شاعر کا دل کیسے خون کے آنسو رو رہا ہے:۔

سرشک خوں، رخصموں پہ چلتا ہے تو اک رستہ نکلتا ہے
ندی دریا پہ تھم جائے
لہو نقطے پہ جم جائے تو عنوان سفر ٹھہرے
اسی رستے پہ سرکش روشنی تاروں میں ڈھلتی ہے
اسی نقطے کی سولی پر پیمبر بات کرتے ہیں[۸]

ترقی پسند اور حق گو شاعر کو کبھی خوف دار ورسن نہیں ہوتا۔ اختر حسین جعفری نے مارشل لاء کے خلاف بے خوف ہو کر لکھا۔ حالانکہ وہ سرکاری محکمہ میں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز تھے لیکن انھیں اپنی ملازمت سے اپنی شاعرانہ غیرت اور ذمہ داری کا زیادہ پاس تھا۔ ایک آمر نے انھیں جابرانہ حکومت کے خلاف شاعری کی بنیاد پر ملک دشمن ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے باوجود اختر حسین جعفری اپنے محاذ پر ڈٹے رہے۔ ایک سچا تخلیق کار جارح اور مزاحمت کار ہوتا ہے۔ اسی مارشل لاء کے دور تاریک میں جہاں فہمیدہ ریاض اور حبیب جالب جیسے تخلیق کار زبان و بیان کی شدت کے جبری اور فسطائی طاقت کے خلاف مزاحمت کی دیوار بن گئے وہیں اختر حسین جعفری اپنے خاص پیرائے تمثال گری، پیکر تراشی اور استعاراتی نظام کی خوبصورتیوں کے ساتھ مزاحمت کاری میں اپنے انفراد پر قائم رہے۔ اسی لیے ان کی شاعری کا ایک خاص طبقہ رہا ہے۔ انکی شاعری کی تفہیم بجائے خود ایک تخلیقی عمل ہے۔ ان کی شاعری سے استفادہ وہی لوگ کرتے ہیں جو اس سمندر میں تیرنا جانتے ہیں۔ مارشل لاء آمریت اور فسائیت جیسے کڑے اور کڑوے مضامین بھی ان کے قلم سے بھرپور شعریت کے ساتھ وارد ہوتے ہیں۔

باغ فلک کا بوڑھا برگد
دار ورسن میں ڈھلتی میلی خشک جٹائیں
ٹہنی ٹہنی سورج تک بڑھتی پرچھائیں

شیر خوش ہیں
شمس و قمر محکومی پر اور منصب، ذات کے زیر وزبر پر شیر خوش ہیں
آنکھیں خیرہ کرنے والی
دولہریں ہیں رنگ سے خالی
پتوں کے دل سے چھلتی پانی سے بھی زیادہ پتلی دھوپ میں اور مفلس شاموں کی
پلکوں سے ٹپ ٹپ گرتی تاریکی میں کچھ فرق نہیں ہے
بوڑھا برگد صدمے ڈھوتی خستہ قدم مزدور ہوائیں
چرخے کاتتی اندھی مائیں۔۔۔[۹]

ایک جمہوری ملک میں آمرانہ قبضے کے بعد ایک مقبول جمہوری جماعت کے سر براہ کو پھانسی دے دینا ایک بڑا قومی اور جمہوری المیہ تھا۔ جس پر دانش وَروں اور شاعروں کا شدید احتجاج سامنے آیا۔ چند کا ہمہ لیس قسم کے شاعروں کو چھوڑ کر باقی تمام شعرا اس ظالمانہ پھانسی کو جمہوریت کی موت گردانتے تھے اور اپنی اپنی سطح پر آمریت کے خلاف سراپا احتجاج تھے۔ اختر حسین جعفری بھی اپنے مخصوص انداز میں اس احتجاج کا حصہ تھے۔ غالب نے اردو ادب میں میاں عارف کا نوحہ لکھ کر جو نوحے کی روایت ڈالی اس کا تسلسل اقبال نے داغ کا نوحہ لکھ کر قائم رکھا۔ فیض نے تقریباً درجن بھر نوحے لکھ کر اس روایت کو امر کر دیا۔ اسی روایت کو لے کر چلتے ہوئے اختر حسین جعفری نے ذوالفقار علی بھٹو کا جو نوحہ لکھا وہ نوحہ نہیں تھا تلمیحات کا ایک سمندر تھا۔ ایسے کاٹ دار مصرعے جو آمر کے گلے میں اٹک کر رہ گئے جنھیں وہ آمر نگل سکتا تھا نہ اگل سکتا تھا۔ بعد میں اسی نظم نوحہ کے مصرعے دہرا کر جنرل نے شاعروں ادیبوں کی چھترول کی۔ انھیں ملکی دشمن اور قومی مفادات پر حملہ کرنے والے قرار دیا:۔

اب نہیں ہوتی دعائیں مستجاب
اب کسی ابجد سے زندان ستم کھلتے نہیں
سبز سجادوں پہ بیٹھی بیبیوں نے
جس قدر حرف عبادت یاد تھے پو پھٹنے تک انگلیوں پر گن لیے
اور دیکھا رحل کے نیچے لہو ہے
شیشہ محفوظ کی مٹی ہے سرخ

سطر مستحکم کے اندر بست و در باقی نہیں
یاالٰہی مرگ یوسف کی خبر سچی نہ ہو
ایلچی کیسے بلاد مصر سے
سوئے کنعاں آئے ہیں[۱۰]

اختر حسین جعفری ایسے لکھاری ہیں جنھوں نے اپنے فن کے ساتھ مکمل انصاف کیا۔ انھوں نے اپنے خیالات و نظریات پر ہر گز سمجھوتہ نہیں کیا۔ اپنے اشعار میں نظریات کے ساتھ ساتھ شعریت کو بھی برقرار رکھا۔ ورنہ اکثر شعراء اپنے نظریات اور جذبات کی رو میں بہہ کر شعریت کی حدود سے کہیں دور نکل جاتے ہیں۔ اس بارے میں پارس جان لکھتے ہیں:

''ماضی میں انقلابیوں کے اندر ایک ایسا رجحان بھی پایا جاتا تھا جو جمالیاتی معیار پر سمجھوتہ کرکے محض انقلابی نعرے بازی کو ادب میں لے آیا۔ اسے ہم پروپیگنڈا کا ادب کہتے ہیں۔ اگرچہ انقلابی سیاست میں اس کی اپنی جگہ ایک اہمیت ہے مگر اسے کبھی دیرپا اور پائیدار ادب نہیں کیا جا سکتا۔''[۱۱]

اختر حسین جعفری کی یہ خوش قسمتی یا بد قسمتی تھی کہ ان کی شاعری کا زمانہ سیاسی بد نظمی و انحطاط کا دور تھا۔ بد قسمتی یہ کہ ان کی حساس طبیعت کو یہ سب جھیلنا پڑا اور خوش قسمتی یہ کہ ان کے قلم سے اسی دورانیہ میں کئی شہکار نظمیں تخلیق ہوئیں۔ ایک مربوط استعاراتی نظام جو انکی شاعری کا خاصہ ہے اس سے کام لیتے ہوئے کیسے کیسے آب دار موتی معرض وجود میں آئے۔ کیسے کیسے جہان معنی پیدا کیے۔ کیسے کیسے سیاسی مضامین کو اپنے ہنر کی برکت سے شعری رفعت عطا کی ہے۔ مثال کے طور پر ایک نظم 'خواب کہاں رہتے ہیں' ملاحظہ ہو:۔

دیکھو میں نے اپنے ہاتھ سے جھلمل جھلمل صبح کے پانی جمع کیے ہیں
میلے چہروں والے خواب کہاں رہتے ہیں
دست ہنر میں جس سورج کی شعائیں آب ہوئی ہیں
ناطق درد کی روشن رات سے نکلا
اور مقفل دروازے پر جو زنجیر ہے اس کا رشتہ

کاسہ لیسوں، تیر اندازوں والی دشمن شام کے دشمن

ساحل سے ہے [۱۴]

خواتین شعراء کے متعلق یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ رومانوی اور عشقیہ جذبات کے موضوعات کو ہی شاعری میں پیش کر سکتی ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ خواتین مردوں کے مقابلے میں حساس ہوتی ہیں۔ وہ حالات کی نزاکت کا احساس اور معاشرے میں ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا ادراک رکھتی ہیں۔ عہد حاضر کے تمام معاشرتی اور سیاسی مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہے۔ ترقی پسند تحریک نے جہاں شاعروں کو متاثر کیا اور وہیں شاعرات کو بھی حیات و کائنات کے مسائل پر نئے زاویے سے سوچنے پر مجبور کیا۔ ادب و شعر کو وہ آگہی نصیب ہوئی جو اس سے پہلے نہ تھی۔ حالات کے کرب کو خواتین شعراء نے نہ صرف شدت سے محسوس کیا بلکہ اپنی نظموں کا موضوع بھی بنایا۔

جب آمریت کے دور کا آغاز ہوا، یحیٰی خان اور ضیا حکومت عوام کو قبول نہ تھی۔ ہر حساس شخص اپنے اپنے انداز میں مزاحمت کر رہا تھا۔ خواتین شعراء نے بھی ان حالات کو دیکھا، محسوس کیا اور لفظوں میں بیان کر دیا۔ اُن میں فہمیدہ ریاض کی شاعری سیاسی، سماجی اور جبر کے خلاف ایم مستند دستاویز ہے۔ ان کی نظموں کا مزاج مزاحمتی ہے۔ وہ اس نظام کے خلاف سر بکف ہیں جو معاشرتی اور سماجی حوالوں سے عورت کو دنیا کی کم ترین چیز قرار دیتا ہے۔ فہمیدہ ریاض ایک حساس، زیرک اور دبنگ لہجہ کی شاعرہ تھیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سماجی تفاوت اور معاشرے میں پھیلی دیگر برائیوں کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ فہمیدہ حقیقت میں استحصال زدہ طبقہ کی ایک موثر، باوقار اور حوصلہ مند آواز تھیں۔ فہمیدہ جہاں ظلم، جبر، ناانصافی کے خلاف ایک توانا آواز تھیں وہیں وہ حقوق نسواں کی بھی علمبر دار تھی۔

فہمیدہ ریاض انھی لوگوں میں سے ایک تھیں جو ہر طرح کی مشکلات، پریشانیاں اور صعوبتیں برداشت کرنے کے باوجود اپنے راستے اور مشن سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ فہمیدہ ریاض بلاشبہ آمرانہ اور جابرانہ رویوں کے مقابل مزاحمت کا روشن، توانا اور معتبر استعارہ ہیں۔ نسائی ادب کے تن مردہ میں نئی روح پھونک کر اسے زندگی کے ساتھ ساتھ نئی سمت دکھانے والی فہمیدہ ریاض کی پوری زندگی استحصالی قوتوں اور رویوں کے خلاف حق کا علم اٹھائے جدو جہد میں گذری ہے۔ فہمیدہ کی شاعری اور اس کا اظہار یہ عورت کو جرات،

حوصلہ اور مضبوط و موثر توانا لہجہ بھی عطا کرتا ہے۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری زخم خوردہ، پسے ہوئے اور ٹھکرائے ہوئے انسانوں کا نوحہ ہے۔ ہمارا معاشرہ جس زبوں حالی کا شکار ہے فہمیدہ اس کی بھرپور عکاس ہیں۔ ان کی شاعری کا کینوس مختلف اور وسیع ہے۔ وہ نسائی احساسات و جذبات کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی گھٹن کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ فہمیدہ کے ہاں جو مزاحمتی فضا پائی جاتی ہے اس میں ایک مردانہ وجاہت کے ساتھ جرات وجسارت بھی ہے۔

فہمیدہ ریاض کی نظموں کا موضوعاتی دائرہ بہت وسیع ہے۔ فہمیدہ کے ہاں جسم اور جذبے کی پکار نمایاں اور بلند آہنگی کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔ لیکن ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے بعد ان کی شاعری میں ایک بڑی تبدیلی آئی اور انھوں نے سیاسی، سماجی جبر کے خلاف آواز بلند کی۔ اس دور کی شاعری میں فہمیدہ ریاض کے موضوعات ہی تبدیل نہیں ہوئے بلکہ مجموعی رویوں میں بھی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے اور جذبات و احساسات کی بجائے مزاحمت کا رنگ غالب آجاتا ہے:

بلند سر بے کسوں کی حرمت
یہی تو تھی جسم وجاں کی قیمت
متاع انمول ہاتھ آئی
لٹا کے دامن سے ساتھ آئی
وہی گھٹی آہ چیخ بن کر ضمیر عالم ٹٹولتی ہے
بہت نمک خوار مضطرب ہیں کہ برملا راز کھولتی ہے
یہی غیرت خاک ہے
کہ جو میرے نطق میں ڈھل کے بولتی ہے [۱۳]

ہمارا معاشرہ طبقاتی اور جاگیردارانہ معاشرہ ہے جس میں سرمایہ دار اور جاگیر دار ہمیشہ مضبوط، طاقت ور اور با اختیار رہا ہے۔ نچلا طبقہ کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔ صدیوں سے اس طبقے کا استحصال جاری ہے۔ فہمیدہ نے اس صورت حال کو محسوس بھی کیا اور اپنی تخلیقات کا موضوع بھی بنایا۔ فہمیدہ ریاض نے سرمایہ دار طبقے کے خلاف آواز اٹھائی اور استحصالی طبقے کی حمایت میں ان کے لہجے میں گہرا طنز نظر آتا ہے:

کوئی نیا پیغام نہ سن لیں

ننگے پاوں بھوکے ہاری
گلی گلی بے حیا بھکاری
موٹی گردن والے افسر
توندیں سہلاتے بیوپاری
جیون بھر ذلت اور خواری
اس کے بدلے نان شبینہ (وہ بھی کسی کسی کو ملے گی)
تم بھی میاں کس دھیان میں بیٹھے
نیر بہاتے ہو بے کار
اس دھرتی پر۔۔۔۔۔۔[۱۴]

فہمیدہ ریاض حقوق نسواں کی نمائندہ آواز ہے۔ اور وہ ان رویوں کی بھرپور ناقد اور خلاف ہیں۔ جو صدیوں سے عورت کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ عورت کا جسم، شاعر، مصور، ادیب اور مجسمہ سازوں کا موضوع رہا ہے اور ان کے نزدیک عورت صرف تفریح اور جنسی تسکین کالازمی جزو بن کر رہ گئی ہے مگر وہ اپنی نظم میں اس کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔

کولھوں میں بھنور جو ہیں تو کیا ہے
سر میں بھی جستجو کا جوہر
تھا پارہ دل بھی زیر پستاں
لیکن مرا مول ہے جو ان پر
گھبرا کے نہ یوں گریز پا ہو
پیمائش میری ختم ہو جب
اپنا بھی کوئی عضو ناپو! [۱۵]

فہمیدہ ریاض استحصال سے پاک اور برابری کے حقوق والی معاشرے کی علم بردار ہیں۔ وہ ہار ماننے والی نہیں بلکہ استحصالی قوتوں سے برسرپیکار ہو کر اور انھیں پاش پاش کر کے آگے بڑھنے والی ایک بہادر اور جری خاتون ہیں۔ وہ سیاست اور معاشرتی تحریکوں کو زندگی سے علیحدہ نہیں سمجھتیں بلکہ وہ ان تحاریک کو زندگی کا حصہ سمجھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تخلیق صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کا

انحصار کرتی ہیں اور یہ صرف فطری عمل ہے بلکہ فن کا فریضہ بھی ہے۔ "کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے "مزاحمت، کے احساس سے لبریز ایک ایسی نظم ہے جس میں فہمیدہ ریاض نے ایک ایسے دور کا نقشہ نہایت خوبصورتی سے کھینچا ہے جب انسان پر زندگی کے دروازے بند کرنے، اسے سانس لینے اور لب ہلانے پر پابندی لگانے کے بھرپور اقدامات اٹھائے جاتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض نے فوجی حکمرانوں کا جس جوانمردی سے مقابلہ اور سامنا کیا ہے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ پاکستانی فوجی حکمران ضیاء الحق سے فہمیدہ کا معرکہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس دور میں فہمیدہ کی آواز دبانے کے لیے ان پر مقدمات قائم کیے گئے۔ خاص طور پر ایک مقدمہ کی سزا پھانسی یا عمر قید ہو سکتی تھی۔

اس دور میں فہمیدہ ریاض نے جتنی نظمیں کہیں وہ اس دور کے ظلم و استبداد اور جبر کی گواہی دیتی ہیں۔ اور جبر کے اس دور کے دل خراش مناظر کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ اب اظہار پر قدغنیں لگائی جاتی ہیں۔ یہ کہنا، سچ لکھنا ایک سنگین جرم قرار دیا جا چکا ہے مگر یہ باغی عورت زخمی ہرنی کی طرح اپنی رفتار سست نہیں پڑنے دیتی وہ شکاری پر زخمی شیر کی طرح پلٹ پلٹ کر وار کرتی ہیں اور حاکم وقت کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جاتی ہیں وہ ڈرتی نہیں، گھبراتی نہیں بلکہ ظالم حکمران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی ہیں:

جب تلک ہے دم میں دم
پھر وہی کریں گے ہم
ہو سکا تو کچھ بڑھ کر
پھر وہ حرف لکھیں گے
تیرہ زاد ہر آمر
کانپ اٹھے جسے پڑھ کر
پھر وہ گیت چھیڑیں گے
بستہ دست ہر مظلوم
جھوم اٹھے جسے گا کر [۱۶]

فہمیدہ ریاض نے ہر طرح کا ستم برداشت کیا اُن کے خاوند کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا۔ اُن کا اپنے ہی ملک کے اندر جینا محال کر دیا گیا یہاں تک کہ اُن کو ملک بدر ہونا پڑا کئی سال ہندوستان میں سیاسی پناہ لے

کر گزارے لیکن ظالم کے سامنے سر جھکانا گوارہ نہیں کیا آمریت کو جائز قرار نہ دیا اس لیے وہ مزاحمت کی بے مثال استعارہ بنتی نظر آتی ہیں۔ یوں تو اُن کی ہر نظم میں مزاحمتی رنگ ملتا ہے لیکن فہمیدہ ریاض کی ایک نظم نے اس کو وہ مقام عطا کر دیا جو حبیب جالب کو ملا تھا۔ اس بارے میں اُن کے کلیات "سب لعل و گہر" کے دیباچے میں عامر حسین لکھتے ہیں:

> ''کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے' میں بیانیے کا ایسا احساس ابھرتا ہے جو ایک دور کے دم گھونٹ دینے والے جبر میں عام آدمیوں کی زندگی پیش کرتا ہے۔ اس میں بھیڑ بھرے راستوں کی گرمی اور دھول ہے، عدالت کی ہراساں بھاگ دوڑ، نوکر شاہی کے دفاتر کی پوشیدہ بدعنوانیاں ہیں اور ماحول میں ہر سمت رواں خوف اور بے چینی، اس نظم میں فہمیدہ ایک 'عوام کے شاعر' کے روپ میں ابھرتی ہیں جو عوام کے دکھ درد اور مایوسی کی اتھاہ گہرائی میں امید کے گیت گاتی نظر آتی ہیں۔'' [۱۷]

اگر ان تینوں شاعروں کے حالات زندگی پر نظر دوڑائی جائے تو یہ تینوں ایک ہی طرح کے حالات سے دوچار نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو بار بار جیل جانا پڑا کسی کو مجبوراً جلاوطنی اختیار کرنے پڑی تو کوئی حکمران کے ڈر سے زیرِ زمین رہا لیکن کسی ہار نہیں مانی۔ سرکاری مراعات کی پیش کشوں کے باوجود عوام کی خاطر سب کچھ قربان کیا۔ حبیب جالب ہو، اختر حسین جعفری ہو یا فہمیدہ ریاض ان سب کی شاعری کے سوتے عوام سے ہی پھوٹتے ہیں اور سب عوام کی نمائندگی کرتے ہیں نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر امیر عارفی، شہر آشوب: ایک تجزیہ (دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۶۸ء)، ۲۳۔
۲۔ حبیب جالب، کلیاتِ جالب (لاہور: طاہر سنز پبلشرز، ۲۰۱۰ء)، ۱۹۷۔
۳۔ حبیب جالب، شاعرِ شعلہ نوا، مرتبہ: سعید پرویز (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۱ء)، ۳۸۔
۴۔ حبیب جالب، کلیاتِ جالب، ۷۹۔
۵۔ ایضاً، ۱۴۰۔
۶۔ ایضاً، ۲۹۳۔
۷۔ اسلم سہراب، آدرش، مرتبہ: حسین انجم (کراچی: جاوداں، اگست ۱۹۹۳ء)، ۲۱۸۔

۸۔ اختر حسین جعفری، آخری اجالا (کلیات) (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ۲۱۳۔

۹۔ ایضاً، ۲۳۹۔

۱۰۔ ایضاً، ۶۸۔

۱۱۔ پارس جان، لبرل ازم پر مارکسی تنقید (لاہور: لال سلام پبلی کشنز، ۲۰۲۱ء)، ۳۶۸۔

۱۲۔ اختر حسین جعفری، آخری اجالا (کلیات)، ۲۲۳۔

۱۳۔ فہمیدہ ریاض، میں مٹی کی مورت ہوں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء)، ۲۷۳۔

۱۴۔ ایضاً، ۷۴۔

۱۵۔ فہمیدہ ریاض، سب لعل و گہر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،، ۲۰۱۱ء)، ۱۳۲۔

۱۶۔ ایضاً، ۳۴۳۔

۱۷۔ عامر حسین، "دیباچہ"، مشمولہ: سب لعل و گہر، فہمیدہ ریاض، ۱۷۔